قائدِ اعظمؒ سے پہلی اور آخری ملاقات

قائدِ اعظمؒ کا انتقال ہوا۔ ان دنوں میں کراچی میں رہتا تھا۔ مدّت کے لحاظ سے اس واقعہ کو چوبیس برس گزر چکے ہیں۔ حالات کے لحاظ سے یہ بات اور زیادہ پُرانی لگتی ہے۔ میں سوچتا ہوں تو بات کل کی معلوم ہوتی ہے۔

کراچی جسے پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا تھا، ایک چھوٹا اور صاف ستھرا سا شہر ہوا کرتا تھا۔ اس شہر کو آج کل کے شہر سے صرف یہ نسبت ہے کہ وہ بھی اسی جگہ آباد تھا۔ اس شہر کے وہ علاقے جہاں ہُو کا عالم ہوا کرتا تھا اور جن کا حق ملکیت بیس پیسے فی گز کے حساب سے ایک پوری صدی کے لیے مل جاتا تھا، آج وہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور میونسپل کارپوریشن وہاں موٹر کار روک لینے پر ایک روپیہ فی گھنٹہ ہرجانہ وصول کرتی ہے۔ جب اس شہر کے دن بدلے تو اس کے حصّے میں حکومت اور دولت کے ساتھ ایک ہجوم بھی آیا۔ اگرچہ دارالحکومت بنے ہوئے اسے مشکل سے ایک سال ہوا تھا، مگر ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہمارے مالک مکان نے عمارت کے ایک ایک حصّے کو علیٰحدہ علیٰحدہ ماہانہ، یومیہ اور گھنٹوں کے حساب سے کرائے پر چڑھایا ہوا تھا۔ ہم تین دوست پاکستان چوک کے ایک فلیٹ کی

نچلی منزل کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ہمارے کمرے کی دو کھڑکیاں سڑک پر کھلتی تھیں، جن میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ مالک مکان کھڑکی کی یہ سلاخیں رات کو کرائے پر اُٹھا دیتا تھا۔ ہم کھڑکی کھول کر سوتے اور رات کو سائیکل رکشا والے اپنی اپنی رکشا ان سلاخوں سے باندھ دیتے تاکہ چوری نہ ہو جائیں۔ منہ اندھیرے وہ آہنی زنجیریں اور تالے کھولتے اور اُن کے شور سے ہماری آنکھ کھل جاتی۔ اخبار والا بھی اسی کھڑکی سے اخبار اندر چارپائی پر ڈال جاتا اور ہم صبح اُٹھتے ہی اخبار پڑھنا شروع کر دیتے۔

اس روز کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ صبح آئی مگر خالی ہاتھ اور بہت دیر سے۔ آنکھ کُھلی تو رکشا زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ دودھ ڈبل روٹی والا اور صبح کے دوسرے پھیری والے غیر حاضر تھے۔ سڑک سنسان تھی، علی الصباح کی آوازیں خاموش تھیں۔ زندگی اور معمول کے آثار صرف اتنے تھے کہ کھڑکی میں ڈان اخبار رکھا ہوا تھا اور اس میں سیاہ حاشیے کے ساتھ قائدِ اعظمؒ کے انتقال کی خبر درج تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ سنّاٹا کیوں طاری ہے۔ جو شخص بھی جاگا اور اس نے یہ خبر سنی، وہ سکتے میں آ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے غم کا اظہار کیسے کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد جیسے کراچی بھر کے لوگوں کی سمجھ میں بیک وقت ایک ہی بات آئی۔ وہ گھروں سے دیوانہ وار نکلے اور گورنر جنرل ہاؤس کی طرف رُخ کر لیا۔ گورنر جنرل ہاؤس کے باہر

بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہاں پورچ میں قائدِاعظمؒ کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔ لوگ قطار اندر قطار وائی ایم سی اے کے بالمقابل دروازے سے داخل ہوتے اور جم خانہ کلب کی جانب گیٹ سے باہر چلے جاتے۔ گھنٹوں بعد میری باری آئی۔ جب لمحہ بھر کے لیے میں ہجوم کے ریلے کے ساتھ پورچ سے گزرا تو دائیں طرف قائدِاعظمؒ کی میت کفن میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ ذرا سا چہرہ کھلا تھا اور اسے دیکھنے کے باوجود مجھے قائدِاعظمؒ کی موت کا یقین نہ آیا۔ یہ چہرہ مجھے ناآشنا سا لگا۔

میں نے قائدِاعظمؒ کو پہلی بار ۱۹۳۸ء کو دیکھا تھا۔ علی گڑھ کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر ایک چھوٹا سا ہجوم جمع تھا۔ ریل آئی تو اس ہجوم میں ذرا سی ہلچل ہوئی۔ پہلے درجے کے ڈبے سے جو شخص نکلا وہ کسی تکلف یا توقف کے بغیر سیدھا لوگوں کے دِلوں میں اُتر گیا۔ روشن بیضوی چہرہ، چمکدار آنکھیں اور گونجدار آواز، کم گو اور کم آمیز، خاموشی میں باوقار اور گفتگو میں بارعب۔ اِستادگی میں اتنے سیدھے کہ اپنی بلند قامت سے بلند تر اور اپنی پختہ عمر سے کم تر لگتے تھے۔ کوئی شخص ان کی مقناطیسیت سے بچ نہ سکا اور ہر شخص ان کی برتری کا قائل ہو گیا۔

چند ماہ بعد قائدِاعظمؒ دوبارہ علی گڑھ آئے۔ ابھی قراردادِ پاکستان کے پیش کرنے اور منظور ہونے میں سال بھر پڑا تھا مگر قائدِاعظمؒ برِّعظیم کے مسلمانوں کے واحد اور سب سے بڑے رہنما تسلیم کیے جا چکے تھے۔ یہ وہ

شب و روز تھے جب قائدِاعظمؒ کی شہرت اور ان کی جماعت کی مقبولیت کو دن دونی اور رات چوگنی ترقّی نصیب تھی۔ چند ہی مہینوں میں اتنا فرق پڑا کہ سارے شہر اور یونی ورسٹی کے مسلمان ریلوے اسٹیشن پر اُمڈ آئے۔ سب ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھے۔ بچوں نے بچّہ مسلم لیگ بنا ڈالی۔ نوجوانوں نے گاہے گاہے جان کی قربانی دینی شروع کر دی۔ بوڑھوں نے مسلم لیگ کی رکنیت کے فارم پُر کر دیے۔ آخر پردہ دار عورتیں کیوں پیچھے رہ جاتیں، اُنھوں نے بھی یونین ہال میں قائدِاعظمؒ کے لیے جلسہ کر ڈالا۔ یونین ہال کی سڑک پر پہلی بار تانگوں کی قطار لگ گئی۔ ان تانگوں پر پلنگ کی سفید چادریں بندھی ہوئی تھیں اور اندر سواریاں برقع پہنے ہوئے تھیں۔ ہال میں ڈائس کے پیچھے چقیں لگی ہوئی تھیں، ان کے پیچھے عورتیں اور لڑکیاں آکر بیٹھ گئیں۔ خواتین کا ایسا جلسہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پردہ دار عورتوں کا جوش و خروش اور ان کی تعداد دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اب مسلم سیاست میں پورا انقلاب آچکا ہے۔ قائدِاعظمؒ اس بار علی گڑھ کیا آئے کہ لوگ سرسیّد کے خواب کی تعبیر اور اقبالؒ کے اشعار کی تاثیر کا ذکر کرنے لگے۔

جلسہ ختم ہوا تو قائدِاعظمؒ سبزہ زار میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہاں بہت سے گروپ فوٹو لیے گئے۔ تصویر کشی ختم ہوئی تو لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی آٹو گراف البم لے کر آئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ قائدِاعظمؒ ٹانگ پر ٹانگ

رکھے ہوئے تھے اور آٹو گراف البم اپنے پہلو پر رکھ کر دستخط کر رہے تھے۔ یہ بات شاید اُنھیں ناگوار تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ اُٹھنا چاہتے ہیں۔ مجھے پریشانی ہونے لگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اُٹھ جائیں اور میں آج ان کے دستخط حاصل نہ کر سکوں۔ یہ دستخط میرے لیے بہت اہم تھے کیوں کہ میں نے پروفیسر ابراہیم شاکیوچن کے دستخط حاصل کرنے کے بعد پہلی بار کسی بڑے آدمی سے اس کے دستخط چاہے تھے۔ کیوچن مجھے اپنے گھر کے صحن میں آرام سے چائے پیتے ہوئے ملے تھے، اس لیے دستخط لینے میں کوئی دِقّت پیش نہ آئی۔ قائدِ اعظمؒ کے چاہنے والے بے شمار تھے اور ہر ایک ان کی توجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گھبرا کر البم قائدِ اعظمؒ کے سامنے کر دی، وہ ابھی دوسری البم پر دستخط کر رہے تھے۔ ایک رُعب دار آواز آئی Wait۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی میرے ہاتھ سے آٹو گراف البم لی اور دستخط کر دیے۔ یہ ۲/ اپریل ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔

مشق

(الف) نیچے دیے ہوئے سوالات کے جوابات لکھیے:

۱- مصنّف نے قدیم اور جدید کراچی کا جو موازنہ کیا ہے، اُسے آپ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲- جب لوگوں کو قائدِ اعظمؒ کے انتقال کی خبر ملی تو کیا سماں تھا؟

۳- مصنف نے قائدِ اعظمؒ کا آخری دیدار کس طرح کیا؟

۴- ۱۹۳۸ء میں جب قائدِ اعظمؒ علی گڑھ آئے، اس وقت کا منظر اور ان کی شخصیت کو مصنف نے کس انداز میں پیش کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

۵- جب قائدِ اعظمؒ دوبارہ علی گڑھ آئے تو بچوں، عورتوں اور مردوں نے ان کی کس طرح پذیرائی کی؟

(ب) متضاد بتائیے:

پُرانی-کلی-دور-رات-شہر-خالی-کُھلی-زندگی-سنّاٹا

(ج) مندرجہ ذیل الفاظ اپنے جملوں میں استعمال کیجیے کہ مفہوم واضح ہو جائے:

مدّت، نسبت، ہجوم، مُنہ اندھیرے، علی الصّباح، حاشیے، قطار اندر قطار، یقین، ناآشنا، کم گو، کم آمیز۔